تفہیم القرآن

(۲)

البقرہ

(از رکوع ۵ تا رکوع ۱۴)

اے بنی اسرائیل[1]! میری اُس نعمت کا خیال کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ

---

[1] اسرائیل حضرت یعقوب کا نام تھا جو حضرت اسحاق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ اس نام کا لفظی ترجمہ "عبداللہ" یا "بندۂ خدا" یا "الیشورداس" ہے۔ بنی اسرائیل اُنھی کی نسل سے ہیں۔ پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اِس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکینِ عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسبِ ذیل باتوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

اولاً، اس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کی امتیں میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر و صلاح کا عنصر موجود ہے انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کو لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبی وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمہارے انبیا اور تمہارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو درکنار، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمھاری تاریخ اور تمھاری قوم کی موجودہ اخلاقی (باقی صفحہ ۸۸ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) دینی حالت خود تمہارے نگاہ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمہاری اپنی چیز ہے، لہذا جانتے بوجھتے حق کی مخالفت نہ کرو بلکہ اسے قبول کرلو اور جو کام تمہارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اٹھے ہیں ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمہارے انبیاء لے کر آئے تھے؛ اصول دین میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس میں قرآن کی تعلیم توراۃ کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اُس کی پیروی کرنے میں اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوئے ہو، اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جا رہی ہے جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اس طرح اتمام حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں، دوسری طرف عامۃ الناس پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا وہ ختم ہو گیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلہ میں کھڑے نہ ہو سکے جس جرأت کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رکوعوں میں نوع انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا اسی کے سلسلہ میں ایک خاص قوم کی متعین مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوام عالم کے سامنے ایک زندہ نمونۂ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایت الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں وہ سب اُس (باقی صفحہ ۹۰ پر)

تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں۔ اور وہ میں ہوں جس سے تم ڈرو۔ میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی پھر سب سے پہلے تم ہی اس کا انکار کرنے والے نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[۱] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۲]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) کی عبرتناک سرگذشت میں نظر آجاتے ہیں۔

رابعاً۔ اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اُس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاء کے پیرو گر گئے۔ یہودیوں کی اخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار پچھلی امتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اسی میں گھسو گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا اور کون!۔ نبی اکرم کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی امتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔

[۲] نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دین اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاء کی طرح انبیاء بنی اسرائیل نے بھی ان کی تاکید کی ہے، مگر یہودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نماز میں تساہل کرنے لگے تھے اور زکوٰۃ دینے کے بجائے سود کھانے لگے تھے۔

تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو! کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک نماز گراں ہے مگر ان فرماں بردار بندوں پر گراں نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ع ۵

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔ اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔

۱؎ یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستہ پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلہ میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستہ پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

۲؎ یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم حق تھا اور جسے اقوام عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا تاکہ وہ بندگی رب کے راستہ پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے۔

۳؎ بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آگئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالات خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انھی بزرگوں کے صدقہ میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا پا سکتا ہے! انھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۶۲] کی غلامی سے نجات بخشی۔ انھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش[۶۳] تھی۔

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گذروادیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا[۶۴] تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے[۶۵]۔ اس وقت تم ظالم تھے، مگر اس پر بھی ہم نے تمھیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گذار بنو۔

---

[۶۱] یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں جنھیں اس قوم کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔

[۶۲] "آل فرعون" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فراعنہ اور مصر کا حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں۔

[۶۳] آزمائش اس امر کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ نیز آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقہ پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گذار بندے بنتے ہو یا کافر نعمت ہو جاتے ہو۔

[۶۴] مصر سے نجات پانے کے بعد جب یہ قوم سینا کے جزیرہ نما میں پہنچ گئی تو حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے چالیس شب روز کے لیے کوہ طور پر طلب فرمایا تاکہ وہاں اس قوم کے لیے جو اب آزاد ہو چکی تھی قوانینِ شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا ہوں۔

[۶۵] گائے یا بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسف کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے منجملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا۔

یاد کرو کہ ٹھیک اس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے، ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان[1] عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعہ سے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا) تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ "اے قوم! تو نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو[2]، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے"۔ اُس وقت تمہارے خالق نے تمہاری توبہ قبول کر لی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں[3]۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقہ نے تم کو آ لیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔

---

[1] فرقان = وہ چیز جس کے ذریعہ سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔

[2] توراۃ کی روایت سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوم کے جن افراد نے گوسالہ پرستی کی تھی اور اسکی ترویج میں حصہ لیا تھا، ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن کے الفاظ اس مفہوم کے محتمل ہیں مگر بعد کی آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا کے نفاذ سے پہلے اللہ نے انہیں معاف کر دیا تھا

[3] یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی جس قرارداد پر حضرت موسیٰ طور کی طرف تشریف لے گئے تھے اس موقع پر آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی لے کر آئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی تو آپ نے اسے ان نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس پر ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ جب تک کہ ہم خود آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہمیں یقین نہیں آسکتا۔

پھر صحرائے سینا میں) ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا[۱]، من و سلوٰی کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[۲] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں اُنھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر جب ہم نے کہا کہ "یہ بستی[۳] جو تمھارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ، ہم تمھاری خطاؤں سے درگذر کریں[۴] گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے"، تو جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخرکار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا،

۱؎ یعنی اس لق و دق بیابان میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔

۲؎ مَنّ اور سلوٰی وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس بے آب و گیاہ بیابان میں ان لوگوں کو مل رہی تھیں۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ یہ چیزیں اب بھی اس علاقہ میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اسی نام سے موسوم ہیں (بائیبل کی کتاب خروج۔ باب ۱۶ میں اس کی تفصیل درج ہے)

۳؎ صحرائے سینا سے گذر کر بنی اسرائیل موآب کے میدانی علاقہ میں پہنچے جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں واقع ہے اور وہاں سے اپنے آبائی ملک کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس موقع پر ان کے سامنے ایک طرف شِطّیم وغیرہ شرق اردن کی بستیاں تھیں اور دوسری طرف دریائے اردن کے مغرب میں اریحا (یا یریحو) تھا۔ غالباً انہی میں سے کسی کو فتح کرنے کا حکم ہوا ہو گا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

۴؎ "سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو" یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسو بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہو، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حِطَّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگذر اور عام معافی کا اعلان کرتے جاؤ۔ تم دوسروں کو معاف کرنے گے تو خدا تمھیں معاف کرے گا۔

ع ۶ اور یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کرتے رہے تھے۔

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو
چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے[۱] اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کونسی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔
اس وقت یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔
یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کرسکتے، اپنے
رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ ترکاری، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ نکال دے"
تو موسیٰ نے کہا "کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجہ کی چیزیں لینا چاہتے ہو[۲]؟ اچھا، کسی شہری آبادی
میں جا رہو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔" آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور
پستی و بدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے
کفر کرنے لگے[۳] اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے[۴]۔ یہ نتیجہ تھا ان کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدودِ
ع ۷ شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔

---

[۱] وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاحوں نے اسے دیکھا ہے اور اس میں شگاف بھی پائے جاتے ہیں۔

[۲] یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لئے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرانوردی تم سے کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی زیادہ مرغوب ہے کہ اس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے برداشت نہیں کرسکتے؟

[۳] آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے مرغوبات یا خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ (باقی صفحہ ۹۵)

یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ نہیں۔[۸۰]

(بقیہ صفحہ ۹۴) ارشاد الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق بدل ڈالا۔

[۷۹] مثلاً حضرت یسعیاہ، یرمیاہ، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام کو قتل کیا، حضرت عیسیٰ کے قتل کا اقدام کیا، بلکہ یہ لوگ اپنی طرف سے تو ان کو سولی پر چڑھا ہی چکے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے انھیں اپنی قدرت سے بچا لیا۔ یہودی علماء اور عوام جن قوانین کے خود قائل تھے اُن کی رو سے بھی اِن انبیاء نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جس کی بنا پر وہ قتل کے مستحق ہوتے۔ ان کا قصور اگر تھا تو یہ تھا کہ انھیں گناہوں پر ٹوکتے تھے، ریا کاریوں پر ملامت کرتے تھے، ایمان داری اور راستبازی کی تائید کرتے تھے۔ اس پر یہ لوگ ان کے دشمن بن گئے اور جھوٹے الزام رکھ رکھ کر انھیں قتل کی سزائیں دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو جھوٹا مقدمہ بنایا گیا وہ اس قوم کے دامن پر ایک مستقل داغ ہے اور اس سے زیادہ بدنما داغ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ جیسے ایک مرد صالح کا سر محض ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کر دیا گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۸۰] جس سلسلہ عبارت میں یہ آیت آئی ہے اس کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے اور اس خیال خام میں مبتلا تھے کہ اُن کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہر حال نجات اس کے لیے مقدر ہے، اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بتایا گیا کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہوگا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔

عمل صالح کے متعلق یہ بات اور ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اعمال کی ظاہری صورتوں کا نام (باقی صفحہ ۹۶ پر)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کو تم پر اٹھا کر تم سے[۱] پختہ وعدہ لیا تھا اور کہا تھا کہ "جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا، اسی ذریعہ سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکو گے۔" مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ معلوم ہے جنھوں نے سبت[۲] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) عمل صالح نہیں ہے، مثلاً نفس یہ فعل کہ تم نے غریب کو کھانا کھلایا، یا کسی بیمار کی مدد کی، نیک عمل نہ کہلائے گا، بلکہ اس لفظ کا اطلاق صرف ان اعمال پر ہوگا جو اللہ کو اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرنے کے بعد، اپنے آپ کو اس کے سامنے ذمہ دار سمجھتے ہوئے، اس کی کتاب اور اس کے نبی کی رہنمائی کے مطابق کیے جائیں۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ خود مختارانہ طریقہ پر آپ جن اعمال کو نیک سمجھتا ہے ان پر عمل کرتا ہے، یا خدا کی رضا کے لیے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے کرتا ہے، یا اعمال کے نیک و بد ہونے کا معیار و ضابطہ خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کے بجائے کہیں اور سے لیتا ہے وہ صالح نہیں، باغی ہے۔ خدا کے اُس بندے کو خدا کی سلطنت میں رہتے ہوئے یہ رویہ اختیار کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی ظاہری نیکی حقیقی نیکی کس طرح ہو سکتی ہے؟ نیکی تو حقیقت میں پابندی قانون کا نام ہے اور خدا کی اس سلطنت میں قانون صرف خدا ہی کا مسلّم ہے۔ اس قانون کی اطاعت سے منہ موڑ کر جو عمل بھی کوئی کرتا ہے وہ سلطان کائنات کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ انسانیت کی عمدہ صفات کا اظہار کرتے ہیں ان میں اور اُن لوگوں میں جو رذیل اور مفسدانہ و شریرانہ صفات کا اظہار کرتے ہیں، خدا کے نزدیک فرق ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اس واقعہ کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ مشہور و معروف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں کھینچا گیا ہے۔

[۲] سبت = ہفتہ کا دن، شنبہ۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص رکھیں اور اس میں کوئی دوسرا کام نہ کریں۔

کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے[1]۔ اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اس زمانہ کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو؟ موسیٰ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو، لہذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔ موسیٰ نے جواب دیا، اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اُٹھے کہ ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے[2]۔ ع ۸

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بیان ہوئی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی۔ اور بعض اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں جسمانی تھا۔ اور میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔

[2] چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض (باقی صفحہ ۹۸ پر)

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے، اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ، دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔[۱] مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمھارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے ــ خیر، تم اس خیال میں نہ رہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل ہے۔

(بقیہ صفحہ ۹۷) کی چھوت لگ گئی تھی اس لیے ان پر فرض کیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اس طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانہ میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اُس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، کجا کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

اب کیا اِن لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو[۱] کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف[۲] کی۔ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملے تو کہہ دیا کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیہ کی بات چیت ہوئی تو کہا کہ بے وقوف ہو گئے ہو؟ اِن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلہ میں انھیں حجت میں پیش کریں[۳]؟ — اور کیا یہ جانتے

۱؎ خطاب اُن نومسلموں سے ہے جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ بات ارشاد فرمانے کی خاص طور پر ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اُس زمانہ میں یہودیوں نے اپنی ظاہری مذہبیت اور اپنے علمِ کتاب کا اچھا خاصا سکّہ اہلِ عرب پر بٹھا رکھا تھا، خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ان یہودیوں سے بہت مرعوب تھے۔ پھر جب مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تو قدرتی طور پر ان کو یہ توقع تھی کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتبِ الٰہی کے پیرو ہیں وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اِس راہ میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ لہٰذا ان کو یہ بتا دینا ضروری تھا کہ یہ لوگ صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں، اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں، دینِ حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں گے۔

۲؎ "ایک گروہ" سے مراد ان کے علماء اور حاملینِ شریعت ہیں۔ "کلام اللہ" سے مراد توراۃ، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعہ سے پہنچیں۔ "تحریف" کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اس کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشاء کے خلاف ہوں۔

۳؎ ان کا مطلب یہ تھا کہ توراۃ اور دیگر کتبِ آسمانی میں جو پیشینگوئیاں اس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ان کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے تمھاری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے؟ ــــ ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو کچھ علم رکھتے نہیں، بس اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جارہے ہیں[۵۵]۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے[۵۶] تاکہ اس کے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کریں ، ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں[۵۷] کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں اِلّا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو، کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے جس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹) بیان نہ کرو ورنہ یہ تمھارے رب کے سامنے ان کو تمھارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فساد عقیدہ کا حال تھا۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔ اسی لیے بعد کے جملہ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۵۔ یہ ان کے عوام کا حال تھا کہ علم کتاب سے کورے تھے، کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اصول بتائے ہیں، اخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور جھوٹی توقعات پر جی رہے تھے۔

۵۶۔ یہ اُن کے علماء کے متعلق ارشاد ہورہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف یہی نہ کیا کہ کلام الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعۂ کتب مقدسہ میں جگہ پالی، اللہ کا کلام بن کر رہ گیا (باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمہ ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمہیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکر میں پڑا رہے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع ۹

یاد کرو! اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا، بالعموم لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب بھی پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل

(حواشی صفحہ ۱۰۰) اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہو گئے۔

۵۵ یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، ہم خواہ کچھ کریں بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۶ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینہ کے اطراف میں جو یہودی قبائل آباد تھے (باقی صفحہ ۱۰۲)

وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے، لہٰذا آخرت میں ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ وہاں انھیں کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع ۱۰

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، پھر عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک[۱] سے اس کی مدد کی۔ مگر یہ تمھارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمھاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمھارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا؟ ـــــ وہ کہتے ہیں، ہمارے دل محفوظ ہیں[۲]۔ نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ـــــ اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) انھوں نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ کی دوسرے قبیلہ سے جنگ ہوتی تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بوجھتے کتاب کی یہ خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلہ کے اسیران جنگ دوسرے یہودی قبیلہ کے ہاتھ آتے تھے تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیہ کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے استدلال کیا جاتا تھا۔ گویا کتاب اللہ کی اس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیران جنگ کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "روح پاک" سے مراد علم وحی بھی ہے، اور جبریل بھی جو وحی کا علم لاتے تھے، اور خود حضرت مسیح کی اپنی پاکیزہ روح بھی جس کو اللہ نے قدسی صفات بنایا تھا۔ اور "روشن نشانیوں" سے مراد وہ کھلی کھلی علامات ہیں جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالب حق انسان یہ معلوم کر سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

[۲] یعنی ہم اپنے عقیدہ وخیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو ہمارے دلوں پر تمھاری بات کا اثر نہ ہوگا۔

کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے[۱۵۱]، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت اِن نہ ماننے والوں پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں[۱۵۲] کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا[۱۵۳]! لہٰذا اب یہ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اُسے مانو تو انھوں نے کہا کہ ہم صرف وہ چیز قبول کرتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی نسل اسرائیل میں) اُتری ہے۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔ اچھا ان سے کہو، اگر تم اُس تعلیم پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل ہی میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمھارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آئے پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا

---

[۱۵۱] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے جب یہودی انتہائی پستی و خستہ حالی میں مبتلا تھے اور دنیا میں ہر جگہ مارے کھدیڑے جا رہے تھے، اُس وقت وہ اپنی گھڑیاں اُس نبی کے انتظار میں کاٹا کرتے تھے جس کی بعثت کی پیشینگوئیاں ان کے انبیا نے کی تھیں، اور دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ عرب اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے یہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے۔

[۱۵۲] اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "کیسی بُری چیز ہے جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا"۔ یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

[۱۵۳] یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دوسری قوم میں پیدا ہوا جسے وہ اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا۔ جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا نواز دیا تو وہ بگڑ بیٹھے۔

بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو طور کو تمھارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں، اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو، اگر تم مومن ہو تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو[۱] اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضا ہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں)۔ اللہ ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ یہ اس معاملہ میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے۔ حالانکہ لمبی عمر بہرحال انھیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ
اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔ ع ۱۱

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو[۲] اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل ہی نے اللہ کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر اس بنا پر کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہے تو اس سے کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کے دشمن

---

[۱] یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے ان کی دنیا پرستی پر۔ جن کو واقعی دار آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

[۲] یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں ہی کو برا نہ کہتے تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریل کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے وہ ہمارا دشمن ہے، وہ رحمت کا نہیں عذاب کا فرشتہ ہے۔

ہیں اللہ اُن کافروں کا دشمن ہے۔ ہم نے تمھاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں، اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کریں گے جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انھوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب اِن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو اِن کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پسِ پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں، اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین، سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے^۱۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ اور پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو"^۲۔ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں^۳۔ ظاہر تھا کہ اذن

۱۔ شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطینِ انس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو جادو ٹونے اور طلسمات و "عملیات" کی طرف ان کی توجہات مبذول ہونے لگیں اور وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے کہ کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں سے سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمھیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انھوں نے سن کر دی۔

۲۔ اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔ مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل کا اخلاقی زوال انتہا کو پہنچا ہوا تھا اس وقت دو فرشتے انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے (باقی صفحہ ۱۰۶ پر)

الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ـــ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انھیں معلوم ہوتا! اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لیے زیادہ بہتر تھا، کاش انھیں خبر ہوتی! ع ۱۲

(بقیہ حواشی صفحہ ۱۰۵) بھیجے گئے تھے، جس طرح قوم لوط کے پاس خوبصورت لڑکوں کی شکل میں فرشتے آئے تھے۔ ان فرشتوں نے ایک ایسی چیز پیش کی جس کے طالب وہی لوگ ہو سکتے تھے جو بداخلاقی کی حد کو پہنچ چکے ہوں۔ پھر اتمام حجت کے لیے وہ ہر ایک کو متنبہ بھی کر دیتے تھے کہ دیکھو ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود وہ لوگ اسی چیز کے طالب ہوئے اور اس طرح ان کا جرم پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ـــ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

ــه یہ اس اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ تھا جس میں یہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کی آخری حد یہ ہے کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔ اس لیے کہ ازدواجی تعلق انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ پس بدترین مفسد وہ ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ لگائے جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ شیطان اعظم ابلیس زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے، پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا، مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں تفرقہ ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے ـــ (باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

اے ایمان لانے والو![105] رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنظُرنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو۔[106] یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہلِ کتاب میں سے ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انھیں عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ ۱۰۵ اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، ان شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان خاص خاص نکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیر بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی موشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری ان سیدھے اور سچے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے، اور خود نبی اکرم کی مجلس میں آکر پُر فریب مکارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجہ کی ذہنیت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

سلہ ۱۰۶ یہودی جب آنحضرت کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقہ سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں انھیں کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ایک ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے، مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "سُن، تو بہرا ہو جائے"۔ اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحبِ رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے، (باقی صفحہ ۱۰۸ پر)

ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی[ا] ۔ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی فرمانروائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبر گیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟ پھر کیا تم اپنے رسول سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۷) اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمھاری سنیں، اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا دیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے انظرنا کہا کرو یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ "توجہ سے بات کو سنو"، یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہییں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [ا] یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے احکام اور اس کے احکام میں فرق کیوں ہے؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ تمھارا قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصہ کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں یا کم از کم ویسی ہی۔

کیے جا چکے ہیں؟ حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ سب ان کی اپنی تمنائیں ہیں، ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی، حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ ع ۱۳

۱۰۹ یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے ذہن میں پیدا کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو، جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو، بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔

۱۱۰ یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحث و مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے، فضولیات میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے نہ کہ وہ۔

یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں، عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ ہی قیامت کے روز کرے گا۔ مگر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ اِن عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں[۱]۔ ان کے لیے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، جس طرف بھی تم رُخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رُخ ہے[۲]۔ اللہ بڑی وسعت والا[۳] اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

---

[۱] یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اِن کے قبضہ واقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے متولی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خداپرست اور خداترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے متولی رہیں، تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی تو انھیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے۔ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکہ کے اس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ان برادرانِ قومی کو جو اسلام لا چکے تھے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا۔

[۲] یعنی اللہ نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ کسی سمت یا کسی مقام میں مقید نہیں ہے، لہذا نہ تو اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا مقام کو مقرر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ وہیں اُسی جانب ہے، اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سمت کو بدل کیوں دیا۔ یہ اشارہ اس اعتراض کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں پر سمتِ قبلہ بدلنے کے سلسلہ میں کر رہے تھے۔ آگے چل کر اس کا مفصل جواب آنے والا ہے۔

[۳] "اللہ بڑی وسعت والا ہے" یعنی وہ نہ محدود ہے نہ تنگ نظر۔

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے اِن باتوں سے، اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں، سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتا؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے بھی لوگ کہتے تھے۔ اِن سب کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں، (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہو گی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں اُن کی طرف سے تم ذمہ دار و جواب دہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے ہر گز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو[۱۱۸]۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اُس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں[۱۱۹]۔ اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ع ۱۴

---

[۱۱۸] یہ عام اہل کتاب کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کبھی تم سے خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی ناراضی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ سچے طالب حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے، بلکہ وہ تو اس لیے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اصول و احکام کو اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جو فروشی کیوں نہ کی جو خود اُن کا شیوہ ہے۔ لہٰذا انہیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کر لو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد و اعمال کی انہی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

[۱۱۹] یہ اہلِ کتاب کے صالح عنصر کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رو سے حق ہو اُسے حق مان لیتے ہیں۔